حفاظتِ قرآن اور متعارض روایات

(مستشرقین کے نقطۂ نظر کا ناقدانہ جائزہ)

حافظ محمود اختر*

محمد عبداللہ**

علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں تاریخ تدوینِ قرآن کے بارے میں جو روایات بیان کی ہیں ان میں بعض روایات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔ان روایات کی بنیاد پر مستشرقین نے قرآن مجید کی حفاظت پر کئی ایک اعتراضات کئے ہیں۔(۱) الاتقان میں علامہ سیوطی نے ایک روایت بیان کی ہے جو حضرت زید ابنِ ثابتؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:"مات النبیﷺ ولم یجمع القران". (۲) نبی کریمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ درآنحالیکہ قرآن کسی جگہ لکھا نہیں گیا تھا۔

اس روایت سے مستشرقین یہ استدلال کرتے ہیں کہ قرآن مجید عہدِ نبویؐ میں لکھا نہیں گیا تھا پھر اسی کی بنیاد پر وہ پوری عمارت تعمیر کر دیتے ہیں کہ جب قرآن مجید عہدِ نبویؐ میں نہیں لکھا گیا تو پھر بعد میں کس بنیاد پر لکھا گیا؟ اور بعد میں لکھے گئے قرآن پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ روایت دراصل علاّمہ جلال الدین سیوطی کے اس اندازِ تحریر کی ایک مثال ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر ہر طرح کی روایات نقل کرتے ہیں یہ انداز بیان دراصل متقدمین کے ہاں عام تھا کہ وہ کسی موضوع کے بارے میں لکھتے وقت اس بارے میں ثقہ وغیر ثقہ، صحیح وسقیم ہر طرح کی روایات بیان کرتے ہیں اور ان دونوں قسم کی روایات میں فرق و امتیاز کرنا قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں اس قسم کی کتب میں مصنف اس طرح کے عنوان بھی قائم کر دیتے ہیں۔ مثلاً کسی نقطہ نگاہ کی حمایت میں موجود دلائل یا ''اس نقطہ نگاہ کی مخالفت میں موجود دلائل'' متقدمین کی کسی کتاب میں کسی روایت کا محض منقول ہونا ہی کافی نہیں۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ انہوں نے یہ روایت کس سیاق وسباق میں اور کس عنوان کے تحت بیان کی ہے۔ روایت کا معنی ومفہوم سیاق وسباق کے اعتبار سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کیا مصنف نے اس روایت کی تائید یا تردید میں کوئی اور روایت بھی بیان کی ہے یا

* پروفیسر/ چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان۔

** ایسوسی ایٹ پروفیسر شیخ زاید اسلامک سینٹر، پنجاب یونیوسٹی، لاہور، پاکستان۔

نہیں؟ اگر اس کی تردید میں کوئی روایت بیان کی ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ کس روایت کی سند زیادہ صحیح، قابلِ اعتبار اور ثقہ ہے۔ اصولی طور پر ہم زیادہ صحیح روایت کو قبول کریں گے اور دوسری کو ترک کردیں گے۔ اسی طرح اس کتاب میں مختلف منقول روایات کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرتے وقت ہم ان سب سے بحیثیت مجموعی ہی کوئی نتیجہ اخذ کریں گے۔ الاتقان اور اس قسم کی دیگر کتب کے اسلوبِ بیان اور طرز تحریر کو سمجھے بغیر حتمی طور پر کچھ کہنا، تحقیق کے اصولوں کے منافی ہے ان کتابوں کے اسلوب اور انداز کے بارے میں ہم نے دوسری جگہ پر روشنی ڈالی ہے۔ سطورِ بالا میں جس روایت کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی اسی طرح کی روایت ہے۔

اس روایت کی سند کا جہاں تک تعلق ہے الاتقان میں یہ روایت ''الدیر العاقولی'' کی کتاب ''کتاب الفوائد'' کے حوالے سے بیان ہوئی ہے۔ اور اس کی سند یوں ہے:

حد ثنا ابراهیم بن بشارحد ثنا سفیان بن عیینة عن الزهری عن عبید عن زید بن ثابت". (٣)

اس روایت سے جہاں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن عہدِ نبویؐ میں جمع نہیں کیا گیا تھا وہاں اسی الاتقان میں موجود مستدرک امام حاکم کی ایک روایت زید ابن ثابتؓ ہی سے منقول ہے۔ جس میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید عہدِ نبویؐ میں لکھا جاچکا تھا اور جمع بھی ہو گیا تھا۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:"کنا عند رسول اللهﷺ نؤلّف القرآن من الرقاع"(٤)''ہم حضورؐ کے پاس بیٹھے قرآن مجید جوڑا کرتے تھے''

اس روایت کے بارے میں امام حاکم فرماتے ہیں:"هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین". (٥)

یہ بات اصولی طور پر بھی طے شدہ ہے کہ ہم بخاری اور مسلم کی روایت کو ترجیح دیں گے امام بیہقی کے حوالے سے ہم نے گذشتہ صفحات میں اس کی وضاحت کی ہے کہ تالیف سے مراد یہ ہے کہ ہم آیات کو ان کے اصل مقام پر رکھ رکھ کر جوڑا کرتے تھے جہاں جہاں ہمیں حضورؐ رکھنے کا حکم فرماتے تھے۔(٦)

مسلمانوں کے ہاں یہ بات اصول کا مقام رکھتی ہے کہ پہلے درجے کی کتبِ حدیث کی روایت کے مقابلے میں چوتھے درجے کی کتاب کی روایت قابل ترجیح نہیں ہوسکتی۔

جب اس روایت کا جائزہ ہم ایک اور پہلو سے لیتے ہیں تو حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ جب ہم اس روایت کو ''الاتقان'' کی دیگر روایات کے ساتھ رکھ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خود علامہ سیوطی نے آگے چل کر ایسی روایات بیان کی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید عہدِ نبویؐ میں لکھا جاچکا تھا۔(٧) تحقیق کا اصول بھی یہی ہے کہ تمام روایات سامنے رکھ کر مجموعی شہادت کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ تمام روایات کا

تقابلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ ایک روایت سامنے رکھ کر جو فیصلہ بھی کیا جائے وہ یک طرفہ فیصلہ ہوگا۔ خصوصاً جبکہ معاملہ حفاظتِ قرآن مجید جیسے اہم مسئلے کا ہوتو فیصلہ مزید احتیاط سے کرنا ہوگا۔

عہدِ نبویؐ میں کتابتِ قرآن مجید کے حوالے سے ایک اشکال یہ ہے کہ

''روایات سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں صرف چار صحابہ کرامؓ نے ہی قرآن جمع کیا تھا''۔(۸)

اس روایت کا جائزہ لیتے ہوئے محققین نے اصل حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید جمع کرنے والوں کی تعداد چار تک محدود نہیں بلکہ ان کی تعداد کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف یہی چار حضرات ہی جامعین قرآن تھے۔ جس روایت میں چار حضرات ابوالدرداءؓ۔ معاذ بن جبلؓ۔ زید ابن ثابتؓ۔ اور ابو زیدؓ کے اسمائے گرامی کا ذکر ہے اس روایت میں اصل مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ جمع قرآن کے سلسلے میں ان چار حضرات کا حصر قبیلہ خزرج کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ انس بن مالکؓ نے یہ بات اس وقت فرمائی جب کہ اوس اور خزرج میں باہمی گفتگو میں مفاخرت کی باتیں ہو رہی تھیں اس بات کا ذکر ابن جریر طبریؒ نے قتادہ کی سند کے ساتھ انس بن مالکؓ سے روایت میں کیا ہے کہ اوس اور خزرج باہم مفاخرت کرنے لگے۔ اوس والے کہنے لگے ہمارا قبیلہ ایسا ہے کہ اس میں چار آدمی ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک کیلئے تو اللہ کا عرش کانپنے لگا وہ سعد بن معاذؓ ہیں۔ کسی کی شہادت دو کے برابر قرار دی گئی۔ وہ خزیمہ بن ثابت ہیں کسی کو ملائکہ نے غسل دیا وہ حنظلہ بن ابی عامر ہیں اور کسی کو شہادت کے بعد ملائکہ آسمان پر لے گئے وہ عاصم بن ثابت ہیں اس پر خزرج کے لوگ کہنے لگے۔ ہم میں سے چار ایسے آدمی ہیں جنہوں نے قرآن جمع کیا اور یہ نام بیان کئے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں یہ فضیلت و سعادت حاصل ہوئی نہ کہ اوس والوں کو۔(۹) گویا اس جگہ قرآن جمع کرنے کا موضوع بنیادی طور پر زیرِ بحث ہے ہی نہیں۔

جہاں تک قرآن عہدِ نبوی میں جمع کرنے والوں کی بات ہے۔ اس سلسلے میں دیگر بہت سی روایات ملتی ہیں جن میں ان لوگوں کے اسمائے گرامی کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے عہدِ نبویؐ میں قرآن جمع کیا تھا۔ ان کی اجمالی فہرست یوں ہے۔ امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق ابوالدرداءؓ، معاذ بن جبلؓ، زید ابن ثابتؓ، ابوزیدؓ، ابی ابن کعبؓ، حضرت عائشہؓ (۱۰) امام نسائی کی روایت کے مطابق ابوموسٰی اشعریؓ، عمرو ابن العاصؓ، سعد بن عبادہؓ، عبادہ بن صامتؓ۔ تہذیب التہذیب کے مطابق عبادہ بن صامتؓ، کنزالعمال کے مطابق، ابوایوب انصاریؓ۔ عقبہ بن عامرؓ۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ زید ابنِ ثابتؓ نے حضرت عمرؓ کیلئے قرآن لکھا تھا۔ اسی کتاب میں ہے عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت حفصہؓ کے پاس بھی قرآن مجید تھا۔(۱۱)

علامہ جلال الدین سیوطی نے اس روایت کا تفصیل سے تنقیدی جائزہ لیا ہے کہ کیا عہدِ نبویؐ میں صرف انہی چار حضرات، ابی ابن کعبؓ۔ معاذ ابن جبلؓ، زید ابن ثابتؓ اور ابو زیدؓ نے قرآن جمع کیا تھا۔(۱۲) علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ انس بن مالکؓ سے ہی ثابت کے طریق پر ایک اور روایت ہے جس میں ابی ابن کعبؓ کی بجائے ابوالدرداءؓ کا نام ہے۔(۱۳)

سیوطی لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں قتادہ کی روایت سے مخالفت پائی جاتی ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ اس میں صیغہ حصر کے ساتھ چار ہی اشخاص کی تصریح کی گئی ہے اور دوسری وجہ ابوالدرداءؓ کا نام ابیؓ ابن کعبؓ کی جگہ آیا ہے۔ اور اماموں کی ایک جماعت نے قرآن کے جمع کرنے کا انحصار چار ہی اشخاص میں محدود کر دینا صحیح نہیں مانا۔(۱۴)

علامہ سیوطی، علامہ مازری (م ٥٣٦ھ) کا بیان نقل کرتے ہیں کہ حضرت انسؓ کے قول سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ان چار اصحابؓ کے علاوہ کسی اور نے قرآن مجید جمع نہ کیا ہو،اوران کی یہ بات فی الواقع درست ہی ہو۔ کیونکہ اس مقام پر کلام کی تقدیر یہ ہوگی کہ حضرت انسؓ کو ان لوگوں کے سوا کسی اور کا قرآن جمع کرنا معلوم نہ تھا اس نے قرآن مجید کو عہدِ رسالت میں جمع کر لیا ہے یا نہیں؟ لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے۔(۱۵) سیوطی لکھتے ہیں:

> اگر حضرت انسؓ کے قول کی بنیاد ان کا ذاتی علم ہی قرار دیں تو پھر یہ اس بات لازم نہیں ہوتی کہ ان کا قول درست بھی ہو۔(۱٦)

علامہ مازری لکھتے ہیں کہ حضرت انسؓ کے اس قول سے ملحد لوگوں نے استدلال کیا ہے۔ حالانکہ اس قول سے نتیجہ اخذ کرنے کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے کیونکہ ہم اس قول کو اس کے ظاہری معنوں پر محمول کرنا تسلیم ہی نہیں کرتے اور فرض کیا کہ ہم اس کے ظاہری معنوں کو صحیح مان لیں تو بھی یہ بات واقعاتی طور پر ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اُس دور میں ایک کثیر تعداد میں قرآن جمع کرنے والوں کے نام کتابوں میں موجود ہیں(۱۷)

علامہ سیوطی، قرطبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بئیر معونہ کے واقعہ میں ستر حافظانِ قرآن شہید ہوئے یمامہ کی لڑائی میں بھی اتنے ہی قرأئے قرآن شہید ہوئے۔ اسکی بنیاد پر سیوطی کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسؓ نے جن چار اصحابؓ کا ذکر کیا ہے ان کے ساتھ انہیں خاص اور بے حد تعلق تھا اور دوسروں سے اس قدر تعلق نہ تھا۔ یا یہ بات ہے کہ حضرت انسؓ کے ذہن میں اتنے ہی لوگ آئے اور دوسرے نہ آسکے۔(۱۸)

علامہ سیوطی، علامہ باقلانی کا قول نقل کرتے ہیں کہ حضرت انسؓ کی اس روایت کی وضاحت کئی طرح سے کی جاسکتی ہے۔ اول اس قول کا کوئی مفہوم ہی نہیں نکلتا۔ اس وجہ سے یہ لزوم بھی نہیں پایا جاتا کہ ان چار اصحاب کے

علاوہ کسی نے قرآن جمع ہی نہ کیا ہو۔ دوم اس سے مراد یہ ہوسکتی ہے کہ قرآن مجید کو تمام ان وجوہ اور قراءتوں پر جن پر اس کا نزول ہوا تھا۔ صرف انہی چار صاحبوں نے جمع کیا۔ سوم قرآن مجید میں سے اس کی تلاوت کے بعد منسوخ شدہ اور غیر منسوخ حصوں کی فراہمی اور حفظ میں ان چاروں کے علاوہ کسی اور نے سعی نہیں کی۔ چہارم یہاں قرآن جمع کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو بلاواسطہ رسول اللہ ﷺ سے سیکھا ہو۔ پنجم ان حضرات نے قرآن پڑھنے پڑھانے پر اپنے اوقات صرف کر دیئے اور اسی وجہ سے ان کی شہرت سب سے زیادہ پھیل گئی۔ ششم یہ کہ اوروں نے یا تو حفظ کیا یا تحریر کیا لیکن ان لوگوں نے حفظ بھی کیا اور تحریر بھی۔ ہفتم یہ کہ ان اصحابؓ کے علاوہ کسی نے بصراحت قرآن کے جمع کرنے سے اس کے احکام کی پابندی اور تعمیل مراد ہے۔ اس قول کی تائید میں وہ ابوالدّرداءؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ کسی نے ان سے کہا کہ میرے بیٹے نے قرآن جمع کر لیا ہے آپؓ نے فرمایا کہ قرآن مجید وہی شخص جمع کر سکتا ہے جو اس کے اوامر ونواہی کی تعمیل کرے۔(۱۹)

حافظ ابنِ حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا احتمالات میں سے اکثر احتمال ایسے ہیں جن میں خواہ مخواہ تکلّف سے کام لیا گیا ہے۔ خصوصاً آخری تشریح تو مکمل طور پر تکلف پر مبنی ہے۔ ابنِ حجر نے جو تشریح اور احتمال خود اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ بیان درحقیقت اوس اور خزرج کی باہمی مفاخرت کی گفتگو کا حصہ ہے دونوں گروہوں نے اپنی اپنی مفاخرت جتائی اسی دوران خزرج والوں نے کہا کہ ہم میں سے چار لوگوں نے قرآن جمع کیا۔(۲۰)

مذکورہ بالا تشریحات کسی نہ کسی طور پر قرینِ حقیقت ہوسکتی ہیں۔ اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ کوئی یا چند پہلو بعید از قیاس ہوں لیکن تمام کے تمام نکات دور دراز کار نہیں ہیں۔ ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس روایت کا مفہوم ومطلوب ہرگز وہ نہیں ہے جو مستشرقین نے فرض کیا ہے۔ درحقیقت اس روایت میں ایک مخصوص پہلو بیان کیا گیا ہے۔ مختلف محققین نے مستند احادیث وآثار کو جمع کیا ہے۔ جن میں عہد نبویؐ میں قرآن حکیم جمع کرنے والوں کے ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان متفرق ومنتشر روایات کو یکجا کیا جائے اور اس عہد میں جامعینِ قرآن کے نام جمع کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم بیس ایسے صحابہؓ تھے۔ جنہوں نے یہ کام سرانجام دیا تھا۔ ان احادیث وروایات کو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

”عن أنس جمع القرآن على عهد النبي ﷺ أربعة كلهم من الأنصار أبّي و معاذ وزيد بن ثابت وأبو زيد قلت من أبو زيد قال أحد عمومتي“(۲۱)

’’حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ عہدِ نبویؐ میں چار حضرات نے قرآن جمع کیا یہ سب انصار میں سے تھے (اور یہ) ابیّ ابن کعبؓ۔ معاذؓ۔ زید ابن ثابتؓ اور ابوزیدؓ تھے‘‘۔

میں نے پوچھا یہ ابوزید کون ہیں؟ کہا کہ یہ میرے چچا ہیں۔ایک روایت میں حضرت انسؓ کا بیان ہے:

"و نحن ورثناہ"(۲۲) یعنی ہم اس کے وارث ہوئے۔

اس کے وارث بنے کا مطلب کیا ہے؟ اسکی وضاحت آئندہ سطور میں کی جائے گی۔حضرت انسؓ کے بیان کا واضح مطلب یہی نظر آتا ہے کہ ان صحابہؓ نے قرآن لکھا ہوا جمع کیا تھا۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں قابل غور ہیں:

۱۔ جمع کا معنیٰ ضم اور تالیف کے ہیں۔ جو کتابت کے ہم معنی ہے۔ حفظ کرنے یا یاد کرنے کے مترادف یا ہم معنی نہیں ہے۔ البتہ ''حفظ'' پر جمع کے لفظ کا استعمال مجاز ہے نہ کہ حقیقت۔ اصول یہ ہے کہ کسی لفظ کا معنی سب سے پہلے وہی لیا جاتا ہے جو حقیقی ہو۔ ہاں اگر حقیقی معنی مراد لینا صحیح نہ ہوتو دوسرا مجازی معنی لیا جاسکتا ہے۔لیکن اس جگہ کوئی ایسی وجہ موجود نہیں ہے کہ معنی حقیقی مراد نہ لیے جائیں۔ بلکہ معنی حقیقی نہ لینے سے یہ روایت غلط ہوگی۔ کیونکہ حفاظِ کرام تو صحابہؓ میں چار سے تو بہر حال زیادہ تھے۔

۲۔ اگر یہاں جمع کا معنی ''حفظ'' لیا جائے اور کہا جائے کہ حافظ قرآن چار تھے تو اس وقت حضرت انسؓ کا یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہم اس کے وارث ہوئے۔ اور یہ بیان خلاف واقعہ بھی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ حضرت انسؓ کا یہ کہنا لاعلمی کی وجہ سے ہو اور انہوں نے اپنے علم و یاداشت کے مطابق ان چار ہی کا ذکر کیا ہوتو اس کے متعلق یہ کہنا کافی ہوگا کہ انسؓ کے اس بیان میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت انسؓ کو اپنی معلومات کی حکایت اور بیان مقصود ہے نہ ایک واقعی بات کا بیان کرنا مقصود ہے اور اگر اس قسم کے معنی کی مؤرخ کے کلام میں گنجائش ہو اور تاریخ کا معنی یہی ہو کہ مؤرخ اپنے علم اور معلومات کو ظاہر کرے تو پھر کبھی کسی مؤرخ سے تاریخی غلطی ممکن نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ روایت غلط تسلیم کی جائے کہ حفاظِ قرآن کا چار سے زیادہ ہونا ایسا یقینی اور مضبوط ہے کہ اس میں کسی قسم کے احتمال اور شک وشبہ کی راہ باقی نہیں۔

۳۔ حضرت انسؓ کا ابوزید کے متعلق یہ کہنا: '' ونحن ورثناہ '' یعنی ہم اس قرآن کے وارث ہوئے اس امر کی روشن شہادت ہے کہ حضرت انسؓ کی غرض یہ ہے کہ ان چاروں نے عہدِ مبارک میں بمقام وکمال قرآن لکھ کر جمع کیا تھا۔ اور ابوزید کے قرآن کے انس وارث ہوئے۔ انسؓ۔ ابوزید کے رشتہ دار تھے اور ابوزید کے نسخے کے وہ ترکے کے طور پر وارث ہوئے۔

حضرت انسؓ کے اس بیان کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت انسؓ۔ابوزید کے مال کے وارث بنے نہ قرآن کے۔لیکن اس صورت میں حضرت انسؓ کا یہ کلام پہلے کلام سے بے تعلق ہوگا اور اس کا پہلے کلام سے

کوئی ربط نہ ہوگا اور وراثتِ قرآن اگر مراد ہوتو اس میں چاروں کے لکھنے پر شہادت ہوگی اور جمع کے معنی کی توضیح ہوگی کہ اس کا معنی لکھنا ہے نہ کہ یاد کرنا اور حضرت انسؓ کا مقصود یہ ہوگا کہ ان چاروں نسخوں میں سے ایک مجھ تک پہنچا تھا۔ جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جس سے ان کی غرض روایت کی توثیق ہے۔ پھر ظاہر اور مرتب کلام اور معنی سے گریز کر کے ایسے معنی مراد لینا جو بے تعلق اور غیر مفید ہیں اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۴۔ ابیؓ بن کعبؓ، ابنِ مسعودؓ، سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ وغیرہ ان حفاظ میں سے ہیں جن کا نام حفاظ کی فہرست میں بڑا نمایاں ہے۔ اہلِ مدینہ میں کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو ان کے اس کمال سے واقف نہ ہوگا۔ حضورؐ نے اعلان عام فرمایا تھا کہ قرآن انہی سے پڑھیں اور ''أقرؤُ نا أُبی'' (۲۳) کا خطاب بھی عطاء کیا گیا تھا۔ ابی ابن کعبؓ کے اس خطاب سے بھی کوئی بے خبر نہ تھا۔ یہ بات باعث تعجب ہوگی کہ حضرت انسؓ جو حضورؐ کے خادمِ خاص اور دربارِ نبوتؐ میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ابی ابن کعبؓ جیسی شخصیت سے واقف نہ ہوں اور اس قسم کی بات کریں کہ ان چار اصحاب کے علاوہ حضورؐ کے عہد میں کوئی حافظِ قرآن نہ تھا۔ اس بحث کے اختتام پر ہم علامہ بدرالدین عینی کی تحقیق پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ان الذین جمعوا القراٰن علیٰ عهد النبیﷺ لا یحصیهم عددولا یضبطهم أحد. (۲۴)

گذشتہ سطور میں جن اصحاب کے نام ذکر کئے گئے ہیں علامہ بدرالدین عینی نے ان میں ابوموسیٰ اشعریؓ۔ مجمع بن جاریہؓ۔ قیس بن ابی صعصعہؓ۔ قیس بن سکنؓ۔ ام ورقہ بن نوفلؓ اور ابنۃ عبداللہ بن حارثؓ کے ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ (۲۵) خطیب بغدادی نے ثابت بن بشیر بن ابی زید کا نام بھی لکھا ہے۔ (۲۶)

مذکورہ بالا جن اصحابؓ کے اسمائے گرامی پیش کئے گئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے قرآن کریم لکھ کر محفوظ کیا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے جمع قرآن پر جمع فی الصدر کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس شبہ کا ازالہ اس طرح ہو جاتا ہے کہ حفاظ صحابہؓ کی تعداد تو شمار میں لانا مشکل ہے۔ جنگ یمامہ میں ستر حفاظ شہید ہوئے۔ بئیر معونہ کے موقع پر ستر حفاظ شہید ہوئے۔ عہدِ نبویؐ کے حفاظ کی تعداد تیس تک تو فتح الباری اور عمدۃ القاری میں موجود ہیں۔ (۲۷)

لہٰذا یہاں جمع کتابی مراد ہے۔ اس سلسلے میں حافظ ابن حجر عسقلانی کا بیان قابل ذکر ہے:

> المراد بالجمع الکتابة فلا ینفی أن یکون غیر هم جمعه حفظا عن ظهر قلب وأما هؤلأ فجمعوه کتابة و حفظوه عن ظهر قلب . (۲۸)

''جمع سے مراد کتابت ہے، لہٰذا اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ ان لوگوں کے علاوہ نے بھی زبانی یاد کر کے جمع کیا تھا، البتہ ان لوگوں نے لکھ کر بھی جمع کیا تھا اور زبانی حفظ بھی کیا ہوا تھا۔''

مستشرقین نے اتقان کی یہ عبارات تو اپنے مقصد کی خاطر خوب اچھالی ہیں کہ عہدِ نبویؐ میں صرف چار لوگوں نے قرآن جمع کیا تھا۔لیکن اس کے ساتھ ہی بالکل متصل وہ لاتعداد روایات بیان کرنے سے احتراز کرتے ہیں جن میں اس بیان کی تشریح کی ہے کہ اس بیان کا مطلب کیا ہے اور یہ کس سیاق وسباق اور پس منظر میں بات کی گئی تھی۔ وہ ان روایات کو بھی بیان نہیں کرتے جن میں ان چار حضرات کے علاوہ دیگر اصحابؓ کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے قرآن عہدِ نبویؐ میں جمع کیا تھا۔ہم آئندہ سطور میں ان روایات کا ذکر کرتے ہیں تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ مستشرقین دانستہ کتمانِ حق کرتے ہیں۔

١۔ ابنِ ابی داوٗد مین محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ عہدِ نبویؐ میں پانچ انصاری صحابہؓ نے قرآن مجید جمع کیا تھا۔(٢٩)

٢۔ ابن ابی داوٗد اور بیہقی نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ رسولؐ اللہ کے عہدِ مبارک میں چھ لوگوں نے قرآن جمع کیا تھا: ابیؓ بن کعب، ابوالدرداءؓ، سعید بن عبیدؓ، ابوزیدؓ، مجمع بن جاریہؓ۔(٣٠)

٣۔ ابوعبید نے کتاب القراءات میں عہدِ نبویؐ کے قراء کا ذکر یوں کیا ہے مہاجرین میں سے خلفائے اربعہؓ، طلحہؓ، سعدؓ، ابن مسعودؓ، حذیفہؓ، سالمؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن السائبؓ، ابن الزبیرؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، ام سلمیٰؓ، انصار میں سے عبادۃ بن صامتؓ، معاذؓ، مجمع بن جاریہؓ، فضالہ بن عبیدؓ، مسلمہ بن مخلدؓ، ابن ابی داوٗد نے ان کے ساتھ حضرت تمیم داریؓ اور عقبہ بن عامرؓ کو بھی شمار کیا ہے۔ابوعمر والدانی نے ابوموسیٰ اشعریؓ کے قرآن کا بھی ذکر کیا ہے۔(٣١)

الاتقان میں علامہ سیوطی نے اور بھی بہت سی روایات نقل کی ہیں جن سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ دیگر بہت سے لوگوں نے بھی قرآن مجید عہدِ نبویؐ میں جمع کیا تھا۔(٣٢)

ان روایات کی صحت یا عدم صحت سے قطع نظر مستشرقین کی علمی دیانت کا اندازہ ہم انہی روایات سے لگا سکتے ہیں کہ باقی تمام روایات سے جو ان کے نقطہ نگاہ کے اثبات کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔آنکھیں بند لیتے ہیں۔

اس ساری تفصیل کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عہدِ نبویؐ میں جن لوگوں نے قرآن مجید جمع کیا تھا وہ محض چار نہ تھے بلکہ ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اور مستشرقین کا یہ موٗقف کسی طرح بھی درست ثابت نہیں ہوتا کہ حضورؐ کی وفات ہوگئی درآنحالیکہ قرآن صرف چار لوگوں کے پاس تھا یا ابھی معرض تحریر میں آیا ہی نہ تھا۔

تیسرا اشکال:

قرآن مجید کی محفوظیت میں شکوک پیدا کرتے ہوئے جو روایات پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔حضورؐ نے کسی شخص کو کچھ تلاوت کرتے سنا۔آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت فرمائے اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد کرادی جسے میں سورت میں سے بھول چکا تھا۔اس روایت کے الفاظ یوں ہیں:

''حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے حضورؐ نے ایک شخص کو رات کے وقت کچھ تلاوت کرتے ہوئے سنا۔آپؐ نے فرمایا اللہ اس شخص پر رحمت فرمائے اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد کرا دی جسے میں فلاں فلاں سورت میں بھول چکا تھا''(۳۳)

اس روایت کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ حضورﷺ نے کسی سے جو آیت سنی تھی وہ منسوخ التلاوۃ آیت ہو۔حضورﷺ اسے کبھی پڑھتے ہوں گے جو اب آپ کو بھلا دی گئی تھی۔(سنقرئك فلاتنسىٰ الا ما شاء اللّٰه)لیکن اس وقت اس شخص کو اس کی تلاوۃ کے منسوخ ہو چکنے کی خبر نہ ہوئی ہو۔نبی کریمﷺ چونکہ وہ آیت پڑھتے رہے تھے اس لئے اس کے سننے پر آپ نے محض جذباتی انداز میں فرمادیا ہو کہ اللہ اس شخص پر رحم کرے۔ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ قرآن میں موجود آیت کے بارے میں حضورﷺ یہ فرمائیں کہ مجھے یہ آیت بھول چکی تھی۔ایسی بات تو آج کل کے پختہ حافظ کے بارے میں بھی نہیں کہی جاسکتی کہ وہ کہے کہ میں فلاں آیت بھول چکا تھا۔آپ تو روزانہ تلاوت فرماتے تھے پھر اس روایت کو اس تناظر میں بھی دیکھیں کہ حضرت جبرائیل،حضورﷺ سے رمضان میں دور کیا کرتے تھے۔آخری رمضان میں یہ دور دو مرتبہ ہوا تھا۔ان تمام حقائق کی روشنی میں اسی روایت کا وہ مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا جو بظاہر نظر آتا ہے۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز حافظے میں موجود ہوتی ہے لیکن اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی دوسرے کے یاد کروانے یا اشارہ کرنے سے توجہ فوراً اس طرف منتقل ہو جاتی ہے اور وہ چیز حافظے میں مستحضر ہو جاتی ہے ایسے موقعے پر کہا جاسکتا ہے کہ''فلاں کے پڑھنے سے آیت مجھے یاد آ گئی''یعنی توجہ اس طرف ہوگئی۔یہ ایک عام محاورہ ہے۔جب قرآن تحریری شکل میں موجود ہو۔ہزاروں لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہو۔چند افراد اگر ایک آیت کو بھول بھی جائیں تب بھی قرآن پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر ایک کو آیت بھولتی ہے تو ہزاروں کے ذھنوں میں تو وہ محفوظ ہے اور ان کے ذریعے وہ آیت مستحضر ہوسکتی ہے۔

مولانا افغانی اس طرح کی روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مستشرقین جن روایات کو لے کر حفظ وتواتر قرآن پر اعتراضات کرتے ہیں اس کا عام جواب جو ایسے تمام مواقع کیلئے اصولی طور پر کافی ہے وہ یہ ہے کہ تواترِ حفظ قرآن،تواتر اور اجماعِ قطعی سے

ثابت ہے اور جو روایات اس کے خلاف پیش کی جاتی ہیں وہ اکثر ضعیف ہوتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ خبر واحد ہوتی ہیں جوظنی ہوتی ہے اورظنی بات کی حیثیت قطعی بات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوتی ہے''(۳۴)

مستشرقین نے عہدِ نبوی میں قرآن کے محفوظ نہ ہونے کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ جن اشیاء پر قرآن لکھا جاتا تھا وہ قابل اعتبار نہیں ہوتی تھیں مسلمان علماء نے ان کے اس نقطہ نگاہ کی بھی خوب وضاحت کر دی ہے کہ کیا وہ چیزیں جن پر قرآن لکھا جاتا تھا قابلِ اعتبار نہ تھیں؟

عہدِ صدیقؓ میں حضورؐ کی لکھائی ہوئی تمام ابتدائی یاداشتوں کا مل جانا خود بھی ایک ایسا واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں پر ان کے لکھنے کا انتظام کیا گیا تھا جو اتنی قلیل مدت یعنی چوبیس، پچیس سال تک محفوظ رہ سکیں۔اس لئے کہ نزول قرآن کے آغاز سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے اس عہد تک جس میں سرکاری طور پر قرآن جمع کیا گیا اتنی مدت ہونی چاہیے۔

یہ نقطہ نگاہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے کہ لکھنے کے سامان کی کمیابی کی وجہ سے حضورؐ کی ابتدائی یاداشتوں کو اس قسم کی چیزوں یعنی چمڑے یا لخاف (پتھر کی باریک تختیوں) عسیب (کھجوروں کی شاخ اور چوڑے پتے) کتف (اونٹ کا شانہ) وغیرہ پر لکھوایا کرتے تھے۔یقیناً ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جسے جاہلی عرب کے صحیح حالات کا علم نہیں۔جیسا کہ کتاب میں دوسری جگہ یہ روایت بیان کی گئی ہے۔صحابہؓ،حضورؐ کے گرد بیٹھ کر قرآنی آیات ترتیب دیا کرتے تھے۔(۳۵)

رقاع، رقعہ کی جمع ہے۔رقاع ایسے چمڑے کے ٹکڑے ہوتے ہیں جو لکھنے ہی کیلئے تیار کئے جاتے تھے۔ گویا پارچمنٹ جسے عربی میں رق کہتے ہیں اس کی تعبیر رقاع کے لفظ سے کی گئی ہے یا پارچمنٹ ہی کی کسی خاص قسم کا نام رقاع ہے۔آخر اس وقت رقاع سے جس طرح کام لیا جاتا تھا۔ابتدائی کتابت کے وقت بھی کیا یہی رقاع نہیں مل سکتا تھا۔رقاع کے بارے میں مجمع البحار میں تحقیق کرتے ہوئے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز لوگ آئیں گے۔''وعلی رقبة رقاع تخفق''(۳٦)

پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ ''اراد بالرقاع ماعلیه من الحقوق والمکتوبة فی الرقاع''(۳۷)

جس کا مطلب یہی ہے کہ دین اور قرض جیسے مطالبات ادا کئے بغیر جو لوگ مر جائیں گے قیامت کے روز ان مطالبات کے وثائق رقاع میں لکھے ہوں گے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''رقاع'' کا یہ لفظ جو رقعہ کی جمع ہے۔ عربوں کا رواج تھا کہ اپنے وثائق ان پر لکھتے تھے۔(۳۸) حضورﷺ نے تحریر کیلئے ایسی چیزوں کا انتخاب فرمایا تھا

جن کے بارے میں عام توقع یہ تھی کہ عام حوادث و آفات کا مقابلہ کر سکتی تھیں ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ان چیزوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ جن الفاظ میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے اُردو میں ترجمہ کرتے ہوئے لاپرواہی سے کام لیا گیا ہے جس سے غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کوئی یوں کہے کہ اسکولوں میں بچے پتھر کے ٹکڑوں پر لکھتے ہیں یا قدیم ہندوستان میں جو لکھنے کا طریقہ تھا اسے بیان کرتے ہوئے کہا جائے کہ تاڑ داڑ کے پتوں پر لکھا کرتے تھے۔ کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر ہوگی کیا سکولوں میں سلیٹ پر لکھنے کا رواج ہے اسے پتھر کے ٹکڑے کہنا ان کی صحیح تعبیر ہے۔ اسی طرح ہندوستان قدیم میں تاڑ کے پتوں پر یوں ہی لکھا جاتا تھا۔ جن لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو نہیں دیکھا ہے انہیں اس کی صحیح نوعیت کا اندازہ نہ ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ کاغذ کے اوراق سے زیادہ بہتر اور محفوظ طریقہ سے تاڑ کے پتوں پر لکھا جاتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں مسلم کتب خانہ ان ہی کتابوں پر مشتمل ہے جو تاڑ کے پتوں پر لکھی گئی ہیں اسے دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس قسم کا مغالطہ ان چیزوں کے متعلق بھی عوام میں پھیلا ہوا ہے جن پر قرآنی وحی کی ابتدائی یاداشتوں کو رسول اللہ ﷺ لکھوایا کرتے تھے۔ مشہور ہوگیا ہے کہ کھجور کی شاخوں بلکہ بعض تو کہہ دیتے ہیں کہ کھجور کے پتوں یا پتھر یا ہڈیوں پر قرآن لکھا جاتا تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ کھجور کے پتوں بلکہ اس کی شاخ میں اتنی گنجائش کہاں ہوتی ہے کہ جس پر سطر بہ سطر ہی لکھا جاسکے۔ اسی طرح بن گھڑے پتھر یا گری پڑی ہڈیوں پر لکھنا کیا آسان ہے؟

احادیث میں ادیم۔ لخاف۔ کتف۔ عسیب۔ اقتاف کے الفاظ آئے ہیں۔ ادیم باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا۔ عرب جو ایک گوشت خور ملک تھا۔ ان کے ہاں سے ادیم کا کافی ذخیرہ مل جاتا تھا۔ حتیٰ کہ خیمہ تک صرف ادیم کے چمڑوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ لخاف ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے تھے بلکہ بالاتفاق اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔ سلیٹ اور لخاف میں گویا صرف رنگ کا فرق تھا۔ اسی طرح اونٹ کے کندھے کے پاس کی ہڈی جو گول ہوتی ہے طشتری کی طرح بن جاتی ہے اس کو خاص طریقے سے تراش کر نکالا جاتا تھا۔(۳۹)

گذشتہ صفحات میں تاریخِ تدوین قرآن مجید کا تفصیلی جائزہ اس انداز سے پیش کر دیا ہے جس سے مستشرقین کے بہت سے اعتراضات کا جواب خود بخود ہی مل جاتا ہے۔

کتابتِ قرآن مجید کا مسئلہ ہو یا حفظِ قرآن کا، ہر دو صورتوں میں اس بات کی کوئی گنجائش موجود نہیں کہ فرض کر لیا جائے کہ قرآن مجید کی حفاظت میں کوئی سقم رہ گیا ہوگا جس کی بناء پر قرآن مجید کا کوئی حصہ ضائع ہو گیا ہوگا۔ حفظ اور کتابت دونوں ساتھ ساتھ موجود تھے کسی ایک پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا۔ ان تمام تفصیلات کے باوجود بھی

مستشرقین کا اپنے موقف پر جمے رہنے پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن مجید کی صحت پر اعتراض کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی کتابوں کے حوالے سے اس اہتمام سے بالکل نامانوس ہیں جو قرآن کی حفاظت کیلئے سامنے آئے۔

مارگولیتھ نے عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید کے غیر مکتوب ہونے پر ایک دلیل یہ دی ہے کہ قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کا مضمون اور الفاظ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔گویا حضورؐ کو یاد نہیں رہتا تھا کہ انہوں نے اس سے قبل قرآن مجید میں کیا شامل کیا تھا۔(٤٠) ان آیات میں سے ایک مثال سورۃ النساء کی آیت نمبر ١٤٠ اور سورۃ الانعام آیت نمبر ٦٨ ہے۔جن کا مضمون اور الفاظ ملتے جلتے ہیں۔

سورۃ النساء کی آیت نمبر ١٤٠ کا ترجمہ یوں ہے:

> ''اور اللہ نے تم مومنوں پر اپنی کتاب میں یہ حکم نازل فرمایا ہے کہ جب تم کہیں سنو کہ اللہ کی آیتوں سے انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے تو جب تک وہ لوگ اور باتیں نہ کرنے لگیں ان کے پاس مت بیٹھو ورنہ تم بھی ان جیسے ہو جاو گے''۔

دوسری آیت سورۃ الانعام کی آیت نمبر ٦٨ کا ترجمہ:

> ''اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں بے ہودہ باتیں کر رہے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ وہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں اور اگر یہ بات شیطان تمھیں بھلا دے تو یاد آنے پر ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو'

پہلی آیت میں (بقول مارگولیتھ) دوسری آیت کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن دونوں کے الفاظ مختلف ہیں۔ ماگولیتھ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قرآن کی آیات لکھی ہوئی نہ تھیں۔اگر قرآن لکھا ہوا ہوتا تو پہلی آیت میں بعینہ وہی الفاظ ذکر کئے جاتے ہیں جو دوسری میں ہیں۔الفاظ کے اس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت کے نزول کے وقت دوسری آیت کے الفاظ محفوظ نہیں رہے تھے۔اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بالکل واضح بات ہے کہ اگر سورۃ نساء کے نزول کے وقت سورۃ الانعام کی مذکورہ آیت کے الفاظ نہ رہے تھے تو پھر بعد میں وہ قرآن میں کس طرح شامل ہوئے۔اگر سورۃ الانعام کے اصل الفاظ محفوظ نہ ہوتے تو اصول کا تقاضا تو یہ تھا کہ بعد میں لکھنے والے سورۃ الانعام میں بھی بعینہ وہ الفاظ لکھتے جو نساء میں ہیں ان دونوں آیات کا لفظی اختلاف تو درحقیقت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں آیات کے الفاظ ہمیشہ سے پوری طرح محفوظ اور غیر متبدل ہیں۔ان میں کسی قسم کے قیاس وگمان کو کوئی دخل نہیں رہا۔اگر قرآن کی کتابت قیاس اور اندازے سے ہوئی ہوتی تو ان آیات کے الفاظ میں

کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان کے محاورات میں جب کبھی سابقہ گفتگو کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ سابقہ گفتگو کے الفاظ بعینہ دہرائے جاتے ہیں جسے انگریزی میں (Direct Narration) کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات وہی الفاظ دہرائے نہیں جاتے بلکہ سابقہ گفتگو کے بنیادی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ جسے Indirect Narration کہا جاتا ہے۔ ان دونوں میں سے پہلی صورت بہت کم استعمال ہوتی ہے۔ یعنی ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کسی سابقہ گفتگو کو بعینہ نقل کیا جائے۔ اس کی بجائے دوسری صورت ہی اختیار کی جاتی ہے۔ سورۃ النساء میں پہلی دوسری صورت اختیار کی گئی ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت اپنے جملوں کی ساخت کے اعتبار سے جداگانہ اسلوب رکھتی ہے۔ لہٰذا اگر ایک سورت کے جملوں کے درمیان کسی دوسری سورت کا جملہ بعینہ جوڑ دیا جائے تو آیات کے تسلسل میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اور اس سے فقروں کی روانی باقی نہیں رہ جاتی جس کی اثر انگیزی سب کے نزدیک مسلم ہے۔ لہٰذا اگر ادبی ذوق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو سورۃ النساء کی مذکورہ آیت میں سورۃ الانعام کے الفاظ بعینہ نقل کر دئے جائیں تو عبارت کا زور اور تسلسل ٹوٹ جائے گا۔ اس کے علاوہ تفسیر ابنِ کثیر میں بیان کیا گیا ہے کہ سورۃ الانعام جس کی مذکورہ آیت کے بارے میں مارگولیتھ کا دعویٰ ہے کہ وہ لکھی ہوئی نہ تھی۔ پوری کی پوری ایک مرتبہ نازل ہوئی اور اس میں یہ آیت بھی موجود ہے:

وهٰذا كتٰب انزلنه مبٰرك مصدق الذى بين يديه

''اور یہ کتاب (ویسی ہی ہے) جسے ہم نے نازل کیا ہے بابرکت جو اپنے سے پہلی کتابوں کو تصدیق کرتی ہے''۔(۴۱)

اس آیت کریمہ میں قرآن کو کتاب کہا گیا ہے۔ اگر سورۃ الانعام کے نزول کے وقت تک قرآن کریم کو لکھنے کا معمول نہ تھا تو اسے کتاب کہنے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ لہٰذا مارگولیتھ کا یہ اعتراض کسی بھی طرح درست ثابت نہیں ہوتا۔(۴۲)

اشکال:

Encyclopaedia Britannica کے مقالہ نگار نے قرآن پر اعتراض کرتے ہوئے کچھ تاریخی شخصیات اور واقعات پیش کئے ہیں کہ قرآن مجید نے یہ واقعات غلط طور پر پیش کئے ہیں۔ مستشرقین کہتے ہیں کہ محمدؐ نے آدمی متعین کر رکھے تھے جو ادھر ادھر پھر کر واقعات اکٹھے کرتے۔ چونکہ محمدؐ زبانی ہی یہ سب کچھ سنتے، اس لئے انہیں ان کے بیان کرنے یا سمجھنے میں غلطی لگ گئی اور آپؐ نے ان واقعات وشخصیات کو غلط طور پر حقیقت کے برعکس

پیش کیا۔ان واقعات وشخصیات میں ایک حضرت مریمؑ ہیں اور قرآن نے مغالطے کی بنیاد پر مریمؑ کا غلط طور پر تعین کرتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کو بھی بنت عمران قرار دیا ہے۔(۴۳)

تنقیدی جائزہ:

اگر مقالہ نگار کسی یقینی دلیل کے ساتھ یہ بھی ثابت کر دیتا کہ حضرت مریمؑ کے والد کا نام عمران نہ تھا تب تو یہ اعتراض کسی طور پر قابلِ اعتبار ہوسکتا تھا۔لیکن حالت یہ ہے کہ اگر ہم انہی سے پوچھیں کہ پھر حضرت مریمؑ کے والد کا نام عمران کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا؟ تو اس کے جواب میں ان کے پاس خاموشی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ان کے والد کا نام بائبل میں بھی مذکور نہیں۔اسی مقالہ میں اعتراف کیا گیا ہے کہ

☆ حضرت مریمؑ کے والدین کے بارے میں پہلی صدی عیسوی کی کسی تاریخی دستاویز میں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔(۴۴)

☆ ایک طرف یہ لاعلمی اور دوسری جانب یہ دعوٰی کہ قرآن حکیم میں حضرت مریمؑ کے والد کا نام مغالطے پر مبنی ہے۔

☆ کیا یہ بات درست ہے کہ اگر ایک مرتبہ کسی کا نام عمران رکھا جا چکا ہو تو اس کے بعد دنیا مین کسی اور شخص کا نام عمران نہیں رکھا جا سکتا۔

☆ قرآن مجید نے تو بہت سے حقائق آشکار کیے ہیں۔بات صرف حضرت عمران تک محدود نہیں۔حضرت مریمؑ کی پیدائش،ان کی تربیت،بچپن اور دیگر بہت سے حالات کے بارے میں خود وہ مآخذ بھی خاموش ہیں۔جنہیں عیسائی مستند سمجھتے ہیں۔چاروں اناجیل میں بھی ان کا ذکر نہیں۔قرآن مجید سب سے پہلے انہیں منظرِ عام پر لایا۔ڈکشنری آف دی بائبل میں مذکور ہے:

> شروع شروع میں عیسائی دنیا ان انکشافات پر اعتراض کرتی رہی مگر اب خود عیسائیت کی ایسی کتابیں دریافت ہو رہی ہیں جن میں قرآن مجید کے بیان کردہ یہی حقائق بیان کئے گئے ہیں(۴۵)

لہٰذا جب عیسائی مآخذ میں حضرت مریمؑ کے والد کے بارے میں کچھ بھی موجود نہیں ہے تو عیسائیوں کو کسی اعتراض کا حق نہیں پہنچتا۔

بائبل کی ایک اور ڈکشنری جو John Mckenzie نے مرتب کی ہے اس میں صراحت کے ساتھ وہ تمام ابہامات بیان ہوئے ہیں جو مریمؑ کی شخصیت کے تعیّن کے سلسلے میں اہلِ کتاب کے ہاں موجود ہیں۔

مصنف لکھتا ہے:

> A by-product of this reticnce is our almost total lack of genuine information concerning the life and person of Mary.(46)

J.D.Douglas کی مرتب کردہ ڈکشنری آف دی بائبل میں اس سلسلے میں لکھا ہے:

There have been various attempts to resolve these differences.(47)

یعنی اناجیل کے ان اختلافات کو حل کرنے کی بہت سی کوششیں ہو چکی ہیں مریمؑ کے بارے میں اناجیل کے اختلافات کے بارے میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار Will Smith کی ڈکشنری آف دی بائبل میں کیا گیا ہے۔(۴۸) لہٰذا جب خود مستشرقین ہی اپنے ساتھی مستشرقین کے نقطہ نگاہ کی تردید کرتے اور حقائق کی وضاحت کرتے ہیں تو حقیقت کی وضاحت کیلئے ہمارے کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

اشکال:

قرآن مجید میں اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے Encyclopaedia Britannica کے مقالہ نگار نے فرعون کے وزیر ہامان کا بھی ذکر کیا ہے کہ قرآن میں یہ غلطی ہے کہ اس نام سے فرعون کے کسی وزیر کا نام بائبل کے عہد نامہ قدیم میں نہیں ملتا۔ مقالہ نگار نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دراصل ہامان، شاہ اسویرس کا وزیر تھا جس کا ذکر بائبل میں ملتا ہے مقالہ نگار کہتا ہے کہ چونکہ محمدؐ نے یہ واقعات زبانی سیکھے تھے لہٰذا مغالطے سے یہ نام فرعون کے وزیر کی طرف منسوب کر دیا۔(۴۹)

مقالہ نگار کے اس نقطہ نگاہ کا تنقیدی جائزہ مولانا تقی عثمانی نے لیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

> ''درحقیقت یہ بات بالکل بے سرو پا ہے۔ اور اسی مفروضے پر مبنی ہے کہ دنیا میں ایک نام کے دو آدمی نہیں ہوسکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسویرس کے جس نام نہاد وزیر کا ذکر مقالہ نگار نے کیا ہے اس کا قصہ صرف بائبل کی ایک مشتبہ کتاب (Apocryphal Book) آستر میں مذکور ہے اس کتاب کو پروٹسٹنٹ فرقہ معتبر تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ مروجہ پروٹسٹنٹ اناجیل میں یہ کتاب موجود نہیں ہے۔ البتہ کیتھولک فرقہ میں اسے مستند سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ہامان یا آمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ شاہ اسویرس کا وزیر نہیں بلکہ صدر دربار تھا(آستر ۱:۳)''(۵۰)

اس کا جو قصہ اس کتاب میں مذکور ہے اسے ہامان کے قرآنی واقعے سے کوئی دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ قرآن نے بیان کیا ہے کہ فرعون نے ہامان کو یہ حکم دیا تھا کہ اس کیلئے ایک بلند محل تیار کروائے تاکہ اس پر چڑھ کر وہ موسیٰ کے خدا کو جھانک سکے۔ قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہامان آخر وقت فرعون کا منہ چڑھا وزیر رہا۔ اور بالآخر اسی کے ساتھ غرق ہوا۔ اس کے برعکس کتاب آستر میں ہامان کی طرف اس نوعیت کا کوئی قصہ منسوب نہیں کیا گیا۔(۵۱)

کتاب آستر کا ہامان۔ بخت نصر کے واقعے کے بعد کا ہے۔ اور اس کا قصہ صرف اس قدر ہے کہ صرف ایک اتفاقی واقعہ کی بناء پر صرف مختصر عرصے کیلئے بادشاہ اسویرس کا تقرب اسے حاصل ہوا۔ لیکن اسی دوران وہ

یہودیوں کے قتل عام کا حکم جاری کروا دیتا ہے۔جس کی بناء پر بادشاہ کی ملکہ آستر اس اس کی دشمن ہوجاتی ہے اور بادشاہ اسے سولی پر لٹکا کر اس کی جگہ ایک یہودی کو نامزد کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت ہشام بن حکیم کے واقعہ کی حقیقت:

مستشرقین نے عہدِ نبویؐ ہی میں قرآن مجید کے کسی متفقہ متن کے مفقود ہونے پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس وقت جبکہ قرآن حکیم نازل ہورہا تھا اور حضورؐ کی ذات گرامی صحابہؓ میں موجود تھی، لوگ قرآن حکیم کی تلاوت میں اختلاف کرتے تھے۔اس کی مثال انہوں نے بخاری اور مسلم شریف میں موجود اس واقعہ سے دی ہے کہ ایک موقع پر نماز میں حضرت ھشام بن حکیم نے ایک قرأت کے مطابق تلاوت کی۔ان کی اقتداء میں حضرت عمرؓ بھی نماز پڑھ رہے تھے ۔نماز کے بعد حضرت عمرؓ انہیں پکڑ کر حضورؐ کی خدمت میں لے گئے ۔حضورؐ نے دونوں سے ان آیات کی تلاوت سنی اور دونوں کو کہہ دیا کہ تم درست پڑھتے رہو۔اس واقعہ سے مستشرقین مندرجہ ذیل نتائج حاصل کرتے ہیں۔

۱۔ عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید کا متفقہ متن موجود نہ تھا۔

۲۔ حضورؐ نے محض سیاسی مصلحت کی خاطر ان دونوں حضرات کی قراءت کو درست قرار دے دیا۔

۳۔ یہ اختلاف، اختلاف قراءت یا سبعہ احرف سے الگ کوئی اور اختلاف تھا۔کیونکہ حضرت عمرؓ اور ہشام بن حکیمؓ دونوں ایک ہی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔(۵۲)

کیا عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید کا متفقہ نسخہ موجود تھا یا نہیں اس پر گزشتہ ابواب میں تفصیلی بحث پیش کر دی گئی ہے۔یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کہ حضرت عمرؓ کو سیاسی مقصد کی بناء پر درست قرار دیا گیا۔اس قسم کی بات وہی شخص کرسکتا ہے جو منصبِ نبوت کی اہمیت سے واقف نہ ہو یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے نہ کہ مکہ مکرمہ کا۔ظاہر ہے مدینہ میں ایسی صورتِ حال نہیں تھی کہ کسی قسم کی چشم پوشی اختیار کی جاتی۔اب مسلمان اُس دور سے بالکل مختلف تھے جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تھے۔کیا حضرت عمرؓ کی ہر بات کو حضورؐ نے ہمیشہ تسلیم ہی کیا تھا؟ اس کا جواب بدر کے قیدیوں کے انجام کے واقعہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے کہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق فیصلہ نہیں دیا تھا۔اگر ان کے خوف اور دبدبے کی بات ہوتی تو حضورؐ ان کی رائے سے کبھی بھی اختلاف نہ کرتے۔

جہاں تک تیسرے اعتراض کا معاملہ ہے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل وضاحت اس مسئلے کی پیچیدگی کو حل کر دیتی ہے۔

۱۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ جب وحی کے ذریعے سات حروف میں قرآن مجید پڑھنے کی اجازت دی گئی تو یہ اجازت خاص خاص اقوام کے ساتھ مخصوص نہیں رہ سکتی تھی۔صرف حضورؐ ہی صحابہ کرامؓ کو قرآن کی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ صحابہ کرامؓ بھی ایک دوسرے کو قرآن پڑھاتے تھے۔اس طرح ایک قبیلہ یا قوم کی خصوصیات دوسری

قوم تک جاسکتی تھیں۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک قوم ایک لفظ کو ایک خاص انداز سے جو دوسری قوم میں مروج ہے ادا نہ کر سکے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسری قوم بھی پہلی قوم کے انداز کے مطابق ادا نہیں کرسکتی۔ مثلاً بنو ہذیل اور بنو ثقیف ''حتیٰ'' کی بجائے ''عتیٰ'' پڑھتے تھے۔ ''حتیٰ'' قریش کے محاورے میں تھا جب کہ دوسرے اسے عتّیٰ کہتے تھے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا کہ قریش ''عتیٰ'' نہیں بول سکتے تھے۔ اگر چہ وہ عام طور پر ''حتیٰ'' ہی بولتے تھے اور یہی اصل لفظ تھا لیکن اگر وہ چاہتے تو عتیٰ بھی پڑھتے تھے۔ چنانچہ ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابنِ مسعودؓ ''حتیٰ حین'' کی بجائے ''عتیٰ حین'' پڑھتے تھے اور حضرت عمرؓ نے انہیں اس سے منع بھی فرمایا تھا کہ بنو ہذیل کے محاورے میں لوگوں کو قرآن نہ پڑھاؤ۔ اصل بات یہ تھی کہ قریش دوسری اقوام کے محاورات کے مطابق الفاظ ادا کرنے کے عادی ہوگئے تھے۔ مکہ مکرمہ میں لوگ ہر سال حج اور میلوں وغیرہ پر جمع ہوا کرتے تھے اور قریش کو چونکہ ہر ایک قوم اور قبیلہ سے لین دین اور تجارت کا واسطہ پڑتا تھا اور علاوہ ازیں علمی مناظرے اور مقابلے بھی ہوتے رہتے تھے اس لئے قریش کیلئے ہر ایک قوم کے محاورے سے واقفیت پیدا کرنی لازمی ہوگئی تھی۔ جس وقت ہشام مسلمان ہوئے اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا اور اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ غالباً حضرت ہشام نے سورۃ الفرقان کی یہ آیات حضورؐ سے اس وقت سنی ہوں گی جب وہ کسی اور قبیلہ کو قرآن پڑھا رہے ہوں گے اور اسی انداز سے انہوں نے یاد کرلیا۔ حضورؐ کی طرف سے بحکم خدا یہ اجازت تھی ''**فاقروا ماتیسر منه**'' یعنی جس طرح آسان ہو اسی طرح پڑھ لو۔ حضرت ہشام نے قریش کے محاورے کے مطابق اسے ادا کرنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی حضورؐ نے انہیں اس طرح پڑھنے سے منع فرمایا جس طرح وہ پڑھ رہے تھے۔ (یاد رہے کہ سبعہ احرف کی اجازت فتح مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ملی تھی جبکہ اسلام دور نزدیک تیزی سے پھیل رہا تھا اور حضرت ہشام بن حکیم فتح مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے) یہ تمام تفصیلات اس بات کو واضح کردیتی ہیں کہ ہشام اور حضرت عمرؓ میں ایک ہی قبیلے سے متعلق ہونے کے باوجود قرأتِ قرآن میں کیوں اختلاف ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے قرآن حکیم اس وقت پڑھا تھا جب قرآن حکیم ایک ہی حرف پر تھا اور ہشامؓ نے ایسے وقت میں سیکھا تھا جب دوسری اقوام کے اسلام میں کثرت سے داخل ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے ان کے اپنے محاورے میں قرآن پڑھانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات مکمل طور پر عیاں ہوجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ اور ہشام بن حکیمؓ کے اس واقعے سے کسی طرح بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید کے متن میں اختلافات پائے جاتے تھے۔ اس

سلسلے میں تفصیلی بحث ''اختلافِ قرأت'' اور ''سبعہ احرف'' کے باب میں کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ جب قرآن حکیم ''سات حروف'' میں نازل ہوا تھا اور تمام حروف منزل من اللہ ہونے کی وجہ سے جائز تھے تو ان میں سے کسی ایک حرف میں پڑھنا اصل وحی کے الفاظ کے مطابق ہی پڑھنا تھا۔قرآن مجید کی حفاظت کے بارے میں ہم اس جگہ سب سے پہلے ایک مستشرق ہی کے خیالات کا ذکر کرتے ہین جس نے قرآن کے محفوظ ہونے کا برملا اعتراف کیا ہے۔ ولیم میور نے عہدِ نبویؐ ،عہدِ صدیقی اور عہدِ عثمانی میں قرآن مجید کی حفاظت پر ایسے دلائل وشواہد پیش کردئے ہیں کہ ان پیش رو ہونے کی وجہ سے تمام مستشرقین کو بھی اس موقف سے متفق ہوکر صحتِ قرآن پر اعتراضات سے دست کش ہو جانا چاہیے۔ذیل میں ہم میور کے اس طویل بیان کا اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو صحت قرآن پر دلالت کرتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) السيوطى،الاتقان فى علوم القرآن،النوع الثامن عشرفى جمعه وترتيبه والنوع الخامس والثلاثون فى آداب تلاوته وتاليه .

(۲) أيضا

(۳) أيضا

(٤) أيضا

(٥) الحاكم :المستدرك على الصحيحين،۲۲۹/۲

(٦) السيوطى:حواله مذكور

(۷) علامہ سیوطی نے الاتقان کی النوع الثامن عشر میں عہد نبوی میں کتابت قرآن مجید کے عنوان کے تحت اس طرح کی روایات تفصیل سے بیان کی ہیں۔

(۸) السيوطى:حواله مذكور

(۹) الطحاوى: شرح مشكل الآثار،۲۲۰/۱٤السيوطى:حواله مذكور

(۱۰) البخارى:الجامع الصحيح،۲۲۸/۳

(۱۱) الاستيعاب ،۱۰۷/۱؛العسقلانى ،فتح البارى ، ٤۲/۹(باب القرآء من أصحاب النبى ﷺ)

(۱۲) أيضا

(۱۳) أيضا

(۱٤) أيضا

(۱٥) أيضا

(۱٦) أيضا

(۱۷) أيضا

(۱۸) أيضا

(۱۹) أيضا

(۲۰) أيضا

(۲۱) البخاری:الجامع الصحیح،کتاب مناقب الأنصار،باب مناقب زید بن ثابت ،حدیث نمبر: ۳۸۱۰،ص۳۰۹

(۲۲) أيضا،کتاب فضائل القرآن باب القرآء من أصحاب النبی ﷺ،حدیث نمبر: ٥۰۰٤،ص٤۳٤

(۲۳) أيضا،حدیث نمبر٤٤۸۱،ص۳٦۷

☆ **بخاری میں لایستوی القعدون والی روایت باب کاتب النبی ﷺ رقم الحدیث ۴۹۸۹**
اس کے علاوہ بخاری میں عہد صدیق میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مشورے اور زید بن ثابتؓ کو حکم والی روایت ہے۔

(۲٤) العینی :عمدۃالقاری ، باب القراء من أصحاب النبی ﷺ ،۲۸/۱۰

(۲٥) أيضا،۲۷/۱۰

(۲٦) السیوطی،الإتقان فی علوم القرآن،

(۲۷) العینی،حواله مذکور،۲۷/۱۰؛العسقلانی:فتح الباری،۱۱/۹

(۲۸) أيضا

(۲۹) السیوطی:حواله مذکور

(۳۰) أيضا

(۳۱) النوع العشرون فی معرفة حفاظه

(۳۲) أيضا

(۳۳) البخاری:الجامع الصحیح،کتاب فضائل القرآن،باب نسیان القرآن،حدیث نمبر: ٥۰۳۷،ص

٤٣٦

(۳۴) افغانی، شمس الحق، علوم القرآن، امجد اکیڈمی، لاہور، س ن، ص۱۲۳

(۳۵) أیضا

(٣٦) رحمانی، عبداللطیف، مولانا، تاریخ القرآن، پروگریسوبکس، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص۴۷ بحوالہ زبدۃ البیان فی رسوم مصاحف عثمان

(٣٧) الترمذی: السنن، کتاب الجنائز، باب قتلی أُحد وذکر حمزۃؓ، حدیث نمبر: ١٠١٦، ص١٧٤٨

(٣٨) السیوطی: الإتقان فی علوم القرآن، ١/٧٣

(٣٩) غلام ربانی، مولانا، تدوین قرآن (از افاداتِ مولانا مناظر احسن گیلانی) مکتبۃ البرہان، دہلی، ۱۹۵۱ء، ص۴۷

(40) Margoliouth: "The Quran" in Encyclopedia of Religion and Ethics. p. x/542

(٤١) الأنعام: ٩٣

(٤٢) عثمانی، محمدتقی: علوم القرآن، ص٢١٨۔٢١٦

(43) Noldeke: Sketches from Eastern History, Khayat, Beruit.p.483/8

(44) Ibid

(45) McKenzie, John, L.Dictionary of the Bible, Geoffrey Chapman, London, 1985, p. 280

(46) McKenzie, John, L.Dictionary of the Bible, Geoffrey Chapman, London, 1985,p. 552

(47) Douglas, J.D.The illustrated Bible Dictionary, Interval City Press, Hodder, 1980,p. 959/2

(48) Smith, William, The New Smiths Bible Dictionary, Doubleday, New York, 1966, p. 230

(49) Noldeke, Ibid.

(٥٠) عثمانی، محمدتقی: علوم القرآن، ص ٢٩٠، ٢٨٩

(٥١) أیضا، ص ٢٩٠

(٥٢) برکت اللہ، پادری، صحت کتب مقدسہ، بائبل سوسائٹی، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص۲۹۶

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆